ڈاکٹر عقیلہ بشیر
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

''شام اودھ'' اور ''سنگِ گراں'': عورت، تصور اور نمائندگی

Dr. Ahsan Farooqi is the famous novelist of Urdu language, but he has a traditional concept of novel. His novels did not reflect the real lives, but he tried several times to fulfil this fact.

In his novel "Shaam-e-Owad" he highlighted the old civilization of the sub-continent, where prostitutes, slavery were more prominent than household women. His another novel "Sang-e-Giran" he reflects the light on limited activities, limited thinking of middle class women. He has conservative mind about the women of the East

ڈاکٹر احسن فاروقی (۱۹۱۲ء–۱۹۷۸ء) اردو زبان کے با سلیقہ ناول نگار اور نقاد ہیں لیکن وہ ناول کا ایک روایتی اور محدود تصور رکھتے تھے۔ اپنے تنقیدی مضامین کے مجموعے ادبی تخلیق اور ناول کے مقدمے میں لکھتے ہیں: ''ناول قصہ ہوتی ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں''[1] اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ:۔ ''شاید اردو کا کوئی ناول نگار مجھ سے زیادہ ناول کے فن سے کبھی واقف ہوا ہو''[۲]

یہ ایک تنقیدی رائے تو ہوسکتی ہے لیکن ظاہر ہے یہ کوئی تحقیقی رویہ نہیں۔ اگر ان کی پہلی رائے کو مدِ نظر رکھا جائے تو یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ ڈاکٹر احسن فاروقی قصے پر انحصار کرنے کی وجہ سے ناول میں زندگی کو بھر پور انداز میں پیش نہیں کر سکتے۔ مثلاً ان کا مشہور ناول ''شامِ اودھ'' زندگی کے مطابق ڈھلتا نظر نہیں آتا بلکہ یوں لگتا ہے کہ ناول کے سانچے میں زندگی کو ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

شام اودھ ایک رومانی اور نیم تاریخی ناول ہے کیونکہ یہاں مصنف نے محدود ہی سہی لیکن قدیم تہذیب کو زندہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس ناول میں سرشار کے ناولوں جیسا نوابی ماحول ہے وہی دربار داری، بارہ دریاں، باغ، محلات، ناچ رنگ کی محفلیں، مجلسیں، چراغاں، درباری مسخرے، برات کے جلوس، تعزیئے کے جلوس، نوابی ٹھاٹ باٹ، اپنی بات رکھنے کے لئے لاکھوں روپے لٹا دینا غرض وہ تمام باتیں جن کو سرشار بھرپور طریقے سے اور اپنی جزئیات سمیت بیان کرتے ہیں یہاں بے حد اختصار سے بیان کی گئی ہیں لیکن زندگی کی وہ گہما گہمی اور زندگی کی چہل پہل کا وہ بھر پور تاثر جو سرشار کے ہاں ملتا ہے یہاں بالکل مفقود ہے۔ مختصراً قصہ یوں ہے کہ اس ناول کے ہیرو بڑے نواب صاحب ہیں جو اپنے خاندان کے لڑکے لڑکیوں کے رشتے ناطے کرنے کا بھی مکمل استحقاق رکھتے ہیں اور اپنی چہتی پوتی انجمن آرا کا رشتہ نواب منصور علی خان کے بیٹے سے طے کر دیتے ہیں لیکن خود انجمن آرا کا لگاؤ حیدر نواب کے ساتھ ہے اور اس کے والد نواب اکبر علی کی بھی دلی خواہش اور تمنا حیدر نواب کو داماد بنانے کی ہے لیکن بڑے

نواب کے عتاب اور خوف سے ان کی زبانیں گنگ ہوکر رہ گئی ہیں جب اپنی محبوب کنیز نوبہار کی زبانی نواب صاحب کو اپنے صاحبزادے اکبر علی کا اس رشتہ سے اختلاف اور انجمن آرا اور حیدر نواب کی والہانہ محبت کا رازِ سربستہ معلوم ہوجاتا ہے تو وہ بالآخر محبت کی پاکیزگی کے قائل ہوکر انجمن آرا کی شادی اس کی خواہش کے مطابق طے کرنے کی اجازت مرحمت فرمادیتے ہیں۔

یہاں جس تہذیب کی نمائندگی کی گئی ہے اس میں گھریلو عورتیں اتنی فعال نہیں ہوتیں جتنی کہ لونڈیاں یا رنڈیاں۔ بڑے نواب کے سامنے ان کی بیویاں یا بہوئیں آنکھ اٹھا کر بات کرسکنے کی جرأت نہیں کرسکتیں مگر ان کی خواص نہ صرف ان کی بات رد کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے بلکہ اپنی بات منوانے کا حوصلہ بھی رکھتی ہے اور پھر اس میں کامیاب بھی ہوتی ہے۔ اس کنیز کا نام نوبہار ہے جو پورے ناول میں اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ ناول کا ہر کردار اس کے سامنے پھیکا پڑتا ہے۔

''یہ لونڈی عجیب مجسمۂ حسن تھی اس کی گیہونوے رنگ، نشیلی آنکھوں، کھلے ہوئے ہونٹوں پر جھاڑ کی سبز روشنی پڑ کر ایک عجیب عالم حسن کا نقشہ دکھا رہی تھی اس کے کندھوں پر پھولدار ریشم کا دوپٹہ اس کے جسم پر کُرتی اور اس کا پٹڑی دار ریشم کا لہنگا اس کے لمبے قد کو ایسی خوشنمائی سے ظاہر کررہے تھے کہ اس کا بیان نہیں ہوسکتا یہ لڑکی عجیب کرشمہ تھی اس کے حسن میں یہ کیفیت تھی کہ اسے دیکھنے والا نئے طور سے زندہ ہوجاتا اور ایک نئے پر کیف عالم میں کھو جاتا۔''[۳]

یہ کنیز کسی طرح بھی انجمن آرا سے کم خوبصورت نہیں لیکن جرأت اور ذہانت میں اس سے کہیں آگے ہے حیدر نواب کو پسند کرنے کے باوجود وہ بڑے نواب سے وفاداری نبھاتی ہے اسے نواب صاحب سے عجیب وغریب محبت ہے وہ نواب صاحب کو یقین دلاتی ہے کہ وہ جوانوں سے بدر جہا بہتر ہیں۔

''سرکار آپ کو جتنی محبت میری جوانی سے ہے مجھے اتنی ہی محبت آپ کے بڑھاپے سے ہے میرا دل آپ کی طرف کھینچا ہے۔''[۴]

چاہا جانا انسان کی فطری کمزوری ہوتی ہے چاہے اس کی عمر کتنی ہی کیوں نہ ہو نواب صاحب بھی اس کمزوری کا شکار ہیں اس محبت کے سہارے نو بہار نواب صاحب کے دل و دماغ پر چھا جاتی ہے یہاں تک کہ وہ ان کے خیال میں رفتہ رفتہ تبدیلی لاتی ہے اور وہ نواب صاحب جو عورتوں کو بے جان مورتی سمجھتے ہیں اور ان کے پڑھنے لکھنے کے بارے میں یہ خیالات رکھتے ہیں:

''آئیں، انجو یہ کیا؟ لکھنا! ہمارے خاندان میں لڑکیاں نہیں سیکھتیں۔ ہماری ناک کٹ جائے گی بس حد ہوگئی۔ ہمارے خاندانی طریقوں میں چوں و چرا کی گنجائش نہیں ہمارا حکم اٹل ہے یہ کس کو خط لکھنے کی شدت پڑی ہے جو لکھنا سیکھنے پر جان جاتی ہے ابھی تو پوری جوان بھی نہیں ہوئی ہو صاحبزادی۔ کھلائے سونے کا نوالا اور دیکھے خون کی نگاہ۔ بس حد ہوگئی''۔[۵]

یہ نواب صاحب آخر میں انجو کی شادی اس کی مرضی کے مطابق طے کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں اور ان کے خیالات کی یہ

تبدیلی نوبہار کی مرہونِ منت ہے اس کردار کے بارے میں پروفیسر عبدالسلام لکھتے ہیں:۔

''اس ناول کا سب سے دلکش، زور دار اور اہم بلکہ کلیدی کردار نوبہار ہے اس ناول کے سارے تصادم اور کشمکش کی جان وہی ہے اس کی قوت نواب صاحب کی کمزوری پر مبنی ہے۔''[۶]

نوبہار کی حیدرنواب سے محبت بھی انفرادیت کی حامل ہے یہ ایک پیچیدہ نفسیاتی مسئلہ ہے اسی محبت کی خاطرہ وہ انجمن آرا میں دلچسپی لیتی ہے۔

''مجھے آپ سے زیادہ دنیا میں کوئی عزیز نہیں کیونکہ میرے دل کے مالک کیلئے آپ دنیا کی عزیز ترین چیز ہیں۔''[۷]

جب انجمن آرا حیرت اور غور سے نوبہار کو دیکھتی ہے تو وہ اس کے جوبات سمجھ کر کہتی ہے:۔

''آپ میرے محبوب مالک کی محبوب ہیں مجھ سے بدگمان نہ ہوئیے آپ کی خدمت میں مجھے دوہری راحت ہے۔''[۸]

وہ یہ نہیں چاہتی کہ لونڈی کی اوقات سے اوپر جائے وہ اپنی تمنا کا اظہار اپنے محبوب یعنی حیدرنواب سے اس طرح کرتی ہے:

''میرے لئے یہی ہے کہ آپ دونوں نواب اور بیگم ہوں اور میں آپ دونوں کی خدمت میں دن گذار دوں۔''[۹]

وہ دونوں کی شادی کروانے کا بیڑا اٹھاتی ہے۔ حیدرنواب اور انجمن آرا دونوں ہمت ہار جاتے ہیں انجمن آرا کی منگنی دونوں کو مایوسی کی انتہا تک پہنچا دیتی ہے مگر نوبہار کے عزم میں کوئی فرق نہیں آتا:

''آپ دونوں سچے عاشق ہیں آپ کی محبت سچی ہے آپ دونوں ایک ہوکر رہیں گے۔''

یہ کیا کہہ رہی ہے تو؟ بیگم نے کہا:

''آج شبِ شہادت ہے آج میں آپ دونوں کو ملانے کے لئے اپنی قربانی کا بیڑا اٹھاتی ہوں۔ آپ کی پاک راہوں کو ضرور ملا دونگی۔''[۱۰]

دوسری طرف انجمن آراء حسن و نزاکت کا مجسمہ ہے جو ہمارے سامنے اس طرح جلوہ گر ہوتا ہے:

''یہ لڑکی گلشنِ شباب کی نوشگفتہ کلی تھی اس کی والہانہ چال، آزادی اور الہڑپن سے یہ ظاہر ہورہا تھا کہ عالمِ جوانی کی مستی کا پہلا نشہ اس کے ساتھ چل رہا ہے اس کی چال قیامت تھی اور اس میں عجب توازن، عجب قدرتی رقص پیدا تھا۔ ریشم کا چھوٹا پاجامہ پہنے، سر سے دوپٹہ اوڑھے، جسم لہراتا ہوا وہ اس طرح آرہی تھی جسے کوئی نزاکت کا مجسمہ سامنے آرہا ہو ہر ایک کی یہ رائے تھی کہ انجمن آرا پر نزاکت ختم ہے اور ہر دیکھنے والے کے دل پر اس کا قد زیبا اس کی چال اور اس کا حسن ایک ایسی ہلکی لکیر بنا دیتا جو ہمیشہ کے لئے نقش ہوجاتی تھی۔''[۱۱]

وہ جس طرح چھپ چھپ کر محبت کرتی ہے اس ماحول میں اسی قسم کی محبت ممکن تھی مجموعی طور پر یہ جامد کردار ہے اور نوبہار کے

کندھے پر ہاتھ رکھا کے آگے بڑھتا ہے اور اسی کی آنکھوں سے دیکھتا اور اسی کی زبان سے بولتا ہے۔ اس کا حیدرنواب سے معاشقہ اور پتنگ کے ذریعے خط و کتاب اور مجلسوں کے دوران چھپ چھپ کر باغ میں ملنا اسے نواب زادی کے درجے سے گرا دیتا ہے۔

اس کردار کے بارے میں ڈاکٹر اسلم آزاد لکھتے ہیں:۔

''انجمن آرا کا کردار نسبتاً کمزور ہے اس میں نو بہار کا عزم اور استقلال نہیں اس ناول کی کشمکش اور تصادم میں اس کا بھی حصہ ہے لیکن اپنی فطری خاموش طبعی کے باعث اس کردار میں زندگی کی توانائی رنگارنگی اور تنوع کا فقدان ہے تاہم یہ اپنے ماحول اور تہذیب کا نمائندہ کردار ہے۔''[۱۲]

احسن فاروقی کے باقی ناولوں میں کوئی ایسا نسوانی کردار سامنے نہیں آتا جس میں بطورِ خاص اتنی قوت ہو کہ وہ اپنی انفرادیت کا اظہار کر سکے البتہ ''سنگِ گراں'' میں چند نسوانی کردار ہیں جو اس وقت کے متوسط گھرانوں کی بہو، بیٹیاں یا مائیں ہیں یہ باپردہ اور ان کی سرگرمیاں محدود ہیں۔ کم پڑھی لکھی خواتین کی طرح ان کی سوچ صرف اسی حد تک محدود ہے کہ شوہر سے پیسے کیسے اینٹھے جائیں اور ان کا جا و بے جا مصرف کیا ہو۔ انہیں اپنے جذبات سے بھی مکمل طور پر آگاہی نہیں تو اپنے شوہر یا کسی اور کے جذبات کو کیا سمجھ سکتی ہیں۔ اس ناول میں عابدہ ایسا ہی کردار ہے جو اپنے شوہر سے اپنے مطالبات باآسانی پورے کرواسکتی ہے اس کے شوہر کا کزن بھی اس پر فریفتہ ہے وہ سب کی محبت وصول کرتی ہے لیکن کسی کی گرمیٔ نظر سے پگھلتی نہیں۔ اس کا سراپا، رکھ رکھاؤ اور بات چیت کا انداز اسے اوسط سے بھی کم ذہنیت کا حامل قرار دیتا ہے۔

''عابدہ منہ پر پوڈر لگا چکی تھی۔۔۔ اس کی شکل صورت کوئی خاص اچھی نہ تھی مگر بری بھی نہیں کہی جاسکتی۔ ٹھنگنا قد، گدبدا جسم، رنگ گندمی، چہرے پر پوڈر بُری طرح لگا ہوا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں، پھولے پھول گال، درمیانی ناک اس میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جو خاص اثر کرے۔''[۱۳]

ایسی عورت پر اگر اس کا شوہر اور شوہر کا کزن عاشق تھے تو ظاہر ہے وہ اس کا شباب ہی تھا اور جوانی میں مرد کے لئے ہر عورت حسین ہوتی ہے اسی لئے ان باپردہ اور اَن پڑھ عورتوں کا زور بمقابلہ مردوں کے زیادہ تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سب مرد عورتوں کی انگلیوں پر ناچ رہے تھے پھر بھی یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں عورتیں غلام ہیں۔ ہاں ان کو وہ آزادی حاصل نہیں جو یورپ کی عورتوں کو حاصل ہے مگر انہیں غلام کہنا بھی غلط ہے۔ ''سنگِ گراں'' میں جس طبقے کو پیش کیا گیا ہے اس میں عموماً ساری محنت اور کمائی مرد کرتے اور گھر لا کر بیویوں کے ہاتھ میں رکھتے جو روپیہ پیسہ قرینے سے خرچ کرنے کی بجائے اللوں تللوں میں ضائع کرتیں۔ شادی بیاہ، مرگ مناجات اور پھر مذہبی تہواروں پر یہ خواتین اپنی ناک اونچی کرنے کے لئے بے دریغ خرچ کرتیں اور لکھنو کے نوابین کو قلاش کرنے میں ان کی ناک کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ جو اس لئے دکھائی نہیں پڑتا کہ یہ پردہ نشین گھر کی چار دیواری میں اپنے شوہروں کو جو راستہ دکھاتیں وہ گھر کے باہر وہی راستہ اختیار کرتے۔

عابدہ بھی اپنے شوہر عارف کی ایسی ہی ایک آقا ہے وہ اپنی پوری آمدنی اسے دیتا ہے اور یہ نہیں پوچھ سکتا کہ وہ اسے کیسے خرچ کرتی ہے۔ یہی سب گھروں کا حال تھا یہ نہیں کہ ان مردوں کو اپنی بیویوں سے عشق تھا یا وہ ان کی محبت کا دم بھرتے تھے تقریباً سب کے جذبات عارف کی طرف ہی تھے جس کا یہ حال ہے کہ:۔

''عابدہ سے اسے محبت نہیں تھی عابدہ میں کوئی بات بھی تو ویسی نہیں تھی جیسی اسے عورتوں میں پسند آتی تھی مگر عابدہ جب اس کے پاس لیٹتی تھی وہ بڑی حسین معلوم ہوا کرتی تھی اتنی حسین کوئی اور عورت کبھی معلوم نہیں ہوئی اور جب عابدہ گھر میں نہیں ہوتی تھی تو گھر خالی خالی معلوم ہوتا تھا''۔[۱۴]

جو عورت صرف اس وقت اچھی لگے جب وہ پاس لیٹی ہو تو ظاہر ہے یہ محبت یا عشق نہیں صرف جسمانی حَظ ہے جس کے لئے مرد ازل سے عورت کے آگے جھکتا آیا ہے اور اس کے لئے عورت کا ذہنی معیار نہیں دیکھا جاتا اور نہ اس کی عادات و اطوار کا جائزہ لیا جاتا ہے اسی لئے عارف اپنی ذہانت اور علم سے محبت کے باوجود بیوی کا اس قدر اسیر ہے کہ جب تک وہ مَر نہیں جاتی اس کی تخلیقی صلاحیتیں ابھر کر سامنے نہیں آتیں اور جو یہ کہا جاتا ہے کہ ہر بڑے مرد کے پیچھے کسی نہ کسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے وہاں کبھی کبھی عورت کا سحر مرد کو ناکارہ بھی بنا دیتا ہے اور اس کی صلاحیتوں کو زنگ آلود کر دیتا ہے۔

پورے ناول میں عابدہ اپنے شوہر کے بجائے اس کے کزن منیر کے زیادہ قریب دکھائی دیتی ہے لیکن مصنف ان کے تعلق کو کہیں بھی اجاگر نہیں کر پایا۔ شاید مشرقی روایات کی امین بیوی کو وہ اتنا پست دکھانا نہیں چاہتا تھا اس لئے منیر جب دِق کا شکار ہوکر مر جاتا ہے تو کچھ ہی روز بعد وہ عابدہ کو بھی اسی مقام پر لاکھڑا کرتا ہے اور اس کے مرنے سے ایک رات پہلے عارف خواب میں دیکھتا ہے:

''منیر دولہا بنے کھڑا ہے اور دوسری طرف سے عابدہ اپنے حسن کے عروج پر چمکتی ہوئی آرہی ہے۔ منیر نے اپنی آغوش پھیلا کر کہا۔ بھابی! میں نے بس تم ہی کو چاہا، میں تمہارا کتنی دیر سے انتظار کر رہا تھا اور آگے بڑھ کو عابدہ کو لپٹا لیا۔''[۱۵]

اگر یہ خواب نہ ہوتا بلکہ منیر اپنی زندگی میں یہ الفاظ اپنے منہ سے ادا کرتا تو زیادہ قرین قیاس تھا مگر اس طرح شاید ایک شریف مشرقی عورت کی پارسائی کا بھید کھل جاتا۔ یوں ڈاکٹر احسن فاروقی اردو کے باسلیقہ ناول نگار تو ہیں مگر ناول کا وہ ایک روایتی اور محدود تصور رکھتے تھے ان کے ناول ان کے مشاہدے کی قوت کے آئینہ دار ہیں مگر اس پر قصہ کی رومانوی دھند چھا جاتی ہے جو حقیقت کو اجاگر نہیں ہونے دیتی۔

حوالہ جات

۱۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر، ''ادبی تخلیق اور ناول''، مکتبہ اسلوب، کراچی، بار اول، ۱۹۶۳ء، ص۹

۲۔ ایضاً، ص۵۳

۳۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر، ''شامِ اودھ''، اردو اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص۱۹

۴۔ ایضاً، ص۲۰

۵۔ ایضاً، ص۳۷

۶۔ عبدالسلام، پروفیسر، ''اردو ناول بیسویں صدی میں''، اردو اکیڈمی، کراچی، بار اول، ۱۹۷۳ء، ص۵۳۰

۷۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر، ''شامِ اودھ''، ص۱۵۸

۸۔ ایضاً، ص۱۵۸

۹۔ ایضاً، ص۱۷۷

۱۰۔ ایضاً، ص۲۸۵

۱۱۔ ایضاً، ص۳۳

۱۲۔ اسلم آزاد، ڈاکٹر، ''اردو ناول آزادی کے بعد''، سیمانت پرکاش، نئی دہلی، بار اول، ۱۹۹۰ء، ص۱۱۹

۱۳۔ احسن فاروقی، ''سنگِ گراں''، اردو اکیڈمی، سندھ کراچی، باراول، ۱۹۶۰ء، ص۲۹-۲۸

۱۴۔ ایضاً، ص۶۰

۱۵۔ ایضاً، ص۲۳۴